اسلامی نظام تعلیم کا مقصد

پروفیسر محمد سلیم صاحب

[یہ مضمون اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مکہ معظمہ (۳۱ مارچ تا ۸؍اپریل ۱۹۷۷ء) میں پیش کیا گیا]

معاشرتی زندگی کا سب سے اہم شعبہ تعلیم ہے۔ آزاد اقوام مُلکی دفاع کے بعد تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ معاشرہ میں خاندانی نظام کو اسی وجہ سے اہمیت اور تقدس حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ افزائش نسل اور انسانی آبادی کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ لیکن معاشرہ کے ان نو واردوں کو تعلیم کے ذریعہ ہی انسان بلکہ مہذب انسان بنایا جا سکتا ہے۔ قوم کے مخصوص انداز فکر اور قوم کی معنویت سے ان کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ خاندان فرد کو وجود خارجی عطا کرتا ہے، تعلیم اسے وجود معنوی بخشتی ہے۔ اس لیے آزاد اقوام اپنے نظامِ تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے انگلستان کی روزمرّہ کی زندگی مختل ہو گئی تھی۔ انگریز قوم نے تعلیم کے قابل پانچ سال سے زائد عمر کے بچوں کو آسٹریلیا بھیج دیا تھا تاکہ وہاں ان کی تعلیم بلاخلل جاری رہے۔

دوسرے علوم کی طرح فنِ تعلیم نے بھی بہت وسعت اختیار کر لی ہے۔ شعبۂ تعلیم میں نئی نئی شاخوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً مقصدِ تعلیم، نفسیاتِ تعلیم، تعلیم کی معیار بندی، نصاب تعلیم، طریق تدریس، امتحانات و اسناد، انتظام شعبۂ تعلیم وغیرہ۔ تعلیم کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ آرٹس کی تعلیم، سائنس کی تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، زرعی تعلیم، غیر درسی تعلیم، کھیل اور ورزش وغیرہ۔ مفکرین نے تعلیم کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے، نئے نئے افکار پیش کیے ہیں۔ نئے نئے تجربات کیے ہیں۔ اس کے بعد سے تعلیم کی

بعض شاخوں نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے فنِ تدریس کے لیے اصول وضوابط اخذ کیے ہیں۔ یہ سب تحقیقات اور تجربات اپنے مقام پر قابلِ قدر ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شعبہ تعلیم میں اصل اہمیت مقصد تعلیم کو حاصل ہے۔ مقصد تعلیم کی روشنی میں دوسرے تمام ذیلی شعبے اپنی کارکردگی کے خطوط متعین کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا ذیلی شاخیں طریقۂ کار سے بحث کرتی ہیں مقصدِ کار سے بحث نہیں کرتیں۔ ظاہر ہے طریقۂ کار کو مقصدِ کار پر فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ ایک طریقۂ کار دوسرے طریقۂ کار سے افضل ہوتا ہے۔ چونے اور اینٹ کی عمارت مٹی اور گارے کی عمارت سے بہتر ہوتی ہے۔ آر سی سی کی عمارت چونے اور اینٹ کی تعمیر سے بھی افضل ہوتی ہے۔ یہ سب درست ہے۔ لیکن یہ سوال کہ عمارت کیا بنے؟ سینما بنے، میکدہ بنے، مدرسہ بنے یا گھر بنے؟ یہ سوال طریقۂ کار کی بحث سے حل نہیں ہو سکتا۔ فنی اور تکنیکی معلومات مقصد کا تعین کرنے میں ہرگز مدد و معاون ثابت نہیں ہوتیں۔

ہر معاشرہ کا ایک محرک اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہر قوم کا ایک مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ جو قوم کے افراد کے دل و دماغ میں رچا بسا ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنے نونہالوں کو مقصد حیات کی تعلیم خود دیتی ہے۔ کسی دوسری قوم سے مقصد حیات، یا مقصد تعلیم مستعار لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فنی اور امدادی معلومات دوسری اقوام سے حاصل کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن فنی اور امدادی معلومات حاصل کرنے کی خاطر دوسروں کا مقصدِ حیات قبول کر لینا قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ کوئی ہوش مند قوم اس اقدام کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ قوم کا تصورِ حیات، اس کی روایات اور اس کی اجتماعی ذہنیت اس کے تعلیمی گہواروں میں تشکیل پاتی ہیں۔ اس لیے جرمن اپنی نئی نسلوں کو فرانک فرٹ اور بون میں، فرانسیسی پیرس اور سوربون میں، انگریز آکسفورڈ اور کیمبرج میں، امریکی پرنسٹن اور ہارورڈ میں، اور روسی ماسکو اور غیف میں تعلیم دلاتے ہیں۔ یہ بات کبھی سننے میں نہیں آئی کہ طلبہ نیویارک سے ماسکو حصولِ علم کے لیے گئے ہوں یا ماسکو سے نیویارک۔ آزاد قومیں تو اپنے علمی ورثہ اور تاریخ کی تدوین میں بھی غیروں کی شرکت گوارا نہیں کرتیں۔ اسرائیل نے یہودی دائرۃ المعارف تیار کرائی تو مسیحی محققین تو کجا غیر صیہونی یہودی محققین کو بھی شرکت کی اجازت نہیں دی۔ آزاد قوموں کے ذہن میں مقاصد کی اہمیت سب سے اعلیٰ اور مقاصد کا شعور سب سے بالا رہتا ہے۔

قدیم زمانہ سے علماء اور حکماء تعلیم کا مقصد متعین کرنے کی کوششوں میں مشغول ہیں۔ مختلف لوگوں نے تعلیم کے مختلف مقاصد بیان کیے ہیں۔ ذیل میں ہم دو مفکرین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یونان کا مشہور فلسفی ارسطو لکھتا ہے کہ تعلیم کا مقصد افراد کو بہترین شہری بنانا ہے۔ ماہرینِ تعلیم کے ایک گروہ میں آج تک یہ مقصد مقبول ہے۔ ارسطو یونان کی شہری ریاست اثینیہ (ATHENS) کا باشندہ تھا۔ یونان کے ہر بڑے شہر کی جداگانہ ریاست تھی۔ اکثر یہ ریاستیں باہم دست و گریباں رہتی تھیں۔ اس پس منظر میں ریاستی وفاداری اور فرمانبرداری کی وہاں بے حد اہمیت تھی۔ اس ماحول میں ارسطو کے نزدیک بھی فرد کی اوّلین حیثیت اُس کا شہری ہونا ہے۔ فی الحقیقت فرد ایک مستقل بالذات اکائی ہے۔ اس کی انفرادی حیثیت اجتماعی حیثیت سے ہرگز فروتر نہیں ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ارسطو کے نظریہ میں تکمیلِ شخصیت جیسے تصوّرات مفقود تھے بلکہ اس کی فکر کلیت پسندی (TOTALITARINISM) کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

جدید یورپ میں آدم اسمتھ نے تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذریعہ ایک فرد کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ قومی دولت میں اضافہ کرے اور قومی پیداوار بڑھائے۔ اشتراکی ممالک میں یہ تصوّرِ تعلیم بہت مقبول ہے۔ وہاں تعلیم کو سرمایہ کاری (INVESTMENT) کے تحت رکھا گیا ہے۔ وہاں انسان کی حیثیت محض ایک معاشی عامل کی ہے۔ یہ شہریت سے بھی محدودتر اور فروتر تصور ہے۔ یہاں انسان مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس کی انفرادی اہمیت کچھ نہیں۔ انفرادی آزادی اور تکمیلِ شخصیت کے تصورات وہاں کی تعلیم میں راہ نہ پا سکے۔ ان مثالوں کا مطالعہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ تعلیم کے مختلف مقاصد اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان میں آفاقیت نہیں ہوتی۔ تنگ نظری اور یک رُخا پن ان میں صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ البتہ اس جائزہ سے ایک اہم سبق ضرور ملتا ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم کا مقصد متعین کرنے سے قبل انسان کا صحیح تصوّر قائم کرنے اور اس کی حیثیت کا تعین کرنا حد درجہ ضروری ہے۔ تصورِ انسان جس قدر ناقص اور محدود ہوگا، مقصدِ تعلیم بھی اسی قدر تنگ اور محدود ہوگا۔

انسان کا صحیح تصور پیش کرنا اور اس کی صحیح حیثیت متعین کرنا بہت دشوار مسئلہ ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا جو تصوّر اور جو حیثیت کسی معاشرہ میں معروف ہوتی ہے، وہاں کے حکماء اسی کو بنیاد بنا کر اپنا فلسفۂ تعلیم مرتب کر ڈالتے ہیں جیسا کہ قدیم یونان اور جدید یورپ کی مثالیں واضح کرتی ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت متعین کرنے کا کیا طریق کار ہو؟ مفکرین اپنے دعوے کس بنیاد پر پیش کرتے

ہیں؟ کیا ان دعووں کے پس پشت کوئی ٹھوس عقلی ثبوت بھی موجود ہے؟ ان وقتی اور ہنگامی وعدوں کی قدر وقیمت آفاقی نقطۂ نظر سے کیا ہے؟ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل جس طرح عالم مادیات میں حقیقت اور صداقت کا ادراک کر لیتی ہے کیا عالم معنویت میں بھی صداقت کا صحیح ادراک کر لیتی ہے؟ اگر وہ یہ استعداد رکھتی ہے تو پھر وہ متفق علیہ نتائج پیش کرنے سے کیوں قاصر ہے؟ جس نے بھی فلسفیانہ افکار کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات اثبات میں نہیں دیئے جا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا تصور قائم کرنا اور اس کی حیثیت متعین کرنے کا کام۔۔۔ عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ انسان ایک روحانی مخلوق ہے۔ اور بقول کانٹ عالم ارواح میں عقل کے پر جلتے ہیں انسان کی حقیقت کا علم، اس کائنات کا علم اور ماورائے کائنات کا علم عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میدان میں عقل کے تمام دعوے محض ادعا ہیں۔ جن کی پشت پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ حکماء اور فلاسفر نے اس میدان میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور انسانیت کے قافلے کو صدیوں سے گمراہی کے رستہ پر بھٹکنے کے لیے چھوڑ گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل یا بالفاظ دیگر فلسفہ اور سائنس کو حریم ذات انسانیت میں اگر بار حاصل نہیں ہے اور وہ انسان کی صحیح حیثیت متعین کرنے سے عاجز ہے تو پھر اس دشواری کا حل کیا ہے۔ اس کا حل صرف مذہب کے پاس ہے۔ قرآن مجید اس مشکل کا حل یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے بعض برگزیدہ بندوں کو وحی کے غیر معمولی علم سے نوازا۔ جو حریم کبریا سے براہ راست نازل شدہ یقینی علم ہے۔ ان کو ان تمام اُمور کی تعلیم دے دی جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، مگر جن کا جاننا حیاتِ ارضی بسر کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ملک اور ہر قوم میں ایسے انبیاء علیہ السلام مبعوث فرمائے جنہوں نے وحی کا علم عام کر دیا۔ جس کے ذریعہ انسانیت فلاح وکامرانی کے صحیح تصورات سے آشنا ہوئی۔ تعلیماتِ وحی کی آخری اور مکمل شکل قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام انسانی مسائل اور مشکلات کے لیے شاہ کلید ہے۔

قرآن مجید بتاتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ دوسری تمام حیثیتیں اس سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔ ضروری ہے کہ اس عظیم الشان منصبِ خلافت کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں چند نکات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱- مغربی مفکرین نے انسان کو اعلیٰ درجہ کا حیوان قرار دیا ہے - زندگی کا مقصود ان کی نگاہ میں حیوانی خواہشات کی بے محابا تکمیل..... اور نشوونمائش کے مظاہرات ہیں۔ مغربی تہذیب و معاشرت کے یہی دو بنیادی اصول ہیں - ظاہر ہے اس کے بعد مغربی معاشرہ میں حیوانیت اور بہیمیت کا غلبہ روز افزوں ہوتا جا رہا ہے - یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کے اثرات بہت دُور رس نکلے ہیں۔

اس کے برخلاف وحی الٰہی نے جو علم عطا کیا ہے، اس کے مطابق انسان فی الحقیقت ایک روحانی مخلوق ہے۔ یہ جسم روح کو بطور آلہ کے ملا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی کارکردگی اور حسنِ عمل کا مظاہرہ کرے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین جسمانی ساخت عطا کی ہے - بہترین ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے نوازا ہے - تاہم اصل اہمیت جسم کو نہیں بلکہ روح کو حاصل ہے۔ روح جسم میں حاکمِ اعلیٰ ہے - جسمانی اور فکری تقاضوں کو ظاہر ہونے کے لیے روح کی پختگی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے - جب تک کسی کام پر دل تیار نہ ہو وہ کام عمل میں نہیں آسکتا۔

۲- مغربی مفکرین کہتے ہیں کہ دنیا کے معاند ماحول میں انسان ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے - وہ انسان اور کائنات کے درمیان کلی مغائرت تسلیم کرتے ہیں - اور کائنات میں انسان کی تنہائی پر ترس کھاتے ہیں۔ انسان کا کام ان کی دانست میں یہ ہے کہ وہ فطرت کی دشمن قوتوں پر قاہرانہ تصرف کرے۔ اسلام بتاتا ہے کہ انسان اور یہ جہان دونوں ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں - دونوں کے درمیان دشمنی اور مغائرت نہیں بلکہ توافق اور سازگاری ہے - دنیا میں بھیجنے سے انسان کی استعدادوں ـــ فکری، عملی، اخلاقی اور رُوحانی ـــ کو بروئے کار لانا مقصود ہے - استعدادوں کو پروان چڑھانے کے لیے یہ رنگ برنگ کی دنیا بہترین میدان عمل اور بہترین مہمیز عمل ہے۔ دنیا کی اَن گنت نعمتوں کے ساتھ انسان کا طرزِ عمل قاہرانہ یا فاتحانہ نہیں بلکہ امانت دار کا سا ہے - مومن انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت تصور کرتا ہے اور اس احساس کے ساتھ استعمال کرتا ہے کہ ایک روز مالک حقیقی کے حضور ان سب کا حساب دینا ہوگا - غیر ذمہ دارانہ اور من مانے طریقے پر استعمال کرنے کے بجائے وہ ان کا جوابدہی کے احساس کے تحت تصرف کرتا ہے۔ اس سے ذمہ دارانہ طرزِ عمل پیدا ہوتا ہے۔

۳- انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے (خلیفہ جانشین اور نائب کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک قسم کی خود مختاری عطا فرمائی - جو دوسری کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔

اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و فہم کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز عطا کی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی بخشی۔ تصرف اور استعمال کے اختیارات عطا کیے۔ دوسری تمام مخلوقات پر فوقیت بخشی۔ زمین و آسمان کی تمام قوتوں کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔ انعامات اور عطیات کی یہ بارش اس لیے کی تاکہ انسان دنیا میں حسنِ عمل کا مظاہرہ کرے۔

لیکن انسان کو مطلق آزادی اور کامل اختیار حاصل نہیں ہے۔ خلیفہ کا لفظ غمازی کرتا ہے کہ نائب کو مالک کے تفویض کردہ اختیارات اس کی وحی کے مطابق استعمال کرنے ہیں۔ تمام صلاحیتوں کو مالک کی مرضی پورا کرنے میں اخلاص کے ساتھ صرف کرنا ہے۔ مزید برآں نیابت کا تصور اس امر کی جانب بھی واضح اشارہ کر رہا ہے کہ اختیارات اور تصرفات کا حساب ایک روز انسان کو اپنے مالک کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔

۴۔ نائب کو مالک کی مرضی اور منشا معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں عمل پیرا ہو۔ زندگی کی پیچ پیچ راہوں میں حق و باطل، صحیح و غلط، جائز و ناجائز رویہ میں تمیز ہونا ضروری ہے.... ــــــ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصی انتظام فرمایا کہ اپنے مخصوص بندوں کو ـــ انبیاء کرام علیہم السلام ـــ انسانوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ ایسے رہنما ہر ملک اور ہر قوم میں آئے۔ انھوں نے مالک کی مرضی اور حقیقت کا صحیح علم انسانوں کو بتایا۔ جاہلیت اور اسلام کا فرق واضح کیا۔ عملاً دنیا میں اسلامی معاشرہ برپا کیا۔ صراطِ مستقیم لوگوں کو دکھائی۔

خلافت بالقوہ تو تمام بنی نوع آدم کو حاصل ہے۔ تمام انسان اس کی دی ہوئی نعمتوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن خلافت فی الحقیقت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ان نعمتوں کو منشائے خداوندی کے مطابق استعمال کر رہے ہیں۔ جو مقاصدِ خلافت کو اخلاص سے پورا کر رہے ہیں، جو سند کامیابی صرف اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔ تصورِ خلافت کی بنا پر اخلاقی اور روحانی قدروں پر مشتمل ایک معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ جس میں تمام بنی آدم ایک کنبہ کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اسلام پیدائشی طور پر ان کے درمیان کسی اونچ نیچ کو تسلیم نہیں کرتا۔ وطن، نسل، رنگ اور لسان کے اختلافات سے شرف انسانیت اور بزرگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ فضیلت اور بزرگی کا معیار حسنِ عمل، حسین کردار اور حسنِ اخلاق میں ہے۔ کوئی

مادی عنصر یا خلقی صفت شرف انسانیت میں نہ کمی کر سکتی ہے نہ اضافہ۔ اس اعلیٰ معیار انسانیت کو اسلام کی اصطلاح میں تقویٰ کہتے ہیں۔ اس معیار نے مادہ پرستی کے تمام تصورات پاش پاش کر ڈالے۔ کالے اور گورے اعلیٰ نسل اور کم اصل کے تمام وصفی تصورات کو ختم کر ڈالا۔ مجرد عقل اس اعلیٰ معیار تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ آج جہاں کہیں اور جس قدر یہ تصور جلوہ گر ہے، وہ سب وحی الٰہی کا فیضان ہے۔

۶۔ یہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان ہے۔ حُسنِ عمل کے مظاہرہ کی جگہ ہے۔ مہلتِ عمر مدتِ امتحان ہے۔ تصرفات اور اختیارات کی آزمائش ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان حُسنِ عمل کا مظاہرہ کرے۔ تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو امانت جان کر ہدایت الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔ اس صورت میں یہ عمل عبادت بن جاتا ہے۔ قربِ خداوندی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اِس سے حیوانی خواہشات کا اظہار بھی ہدایت الٰہی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ خود انضباطی کی عادت پڑتی ہے۔ زندگی اگر اس طرح بسر ہو تو پھر وہ عبادت ہے۔ عظیم منصبِ خلافت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس تصور کے تحت دنیا کے کاروبار میں مصروف رہنے کے باوصف انسان کے اندر ایک قسم کی رفعت اور بے لوثی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بڑی حد تک ادنیٰ جذبات کو دبائے رکھتی ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا اخلاقی اور روحانی تصور ہے جس سے عقل کے پرستار اور دنیادار قسم کے لوگ بیگانہ ہیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کی کائنات کا دائرہ لامحدود ہے۔ اس کا ایک جزو یہ ہماری دنیا ہے۔ اور اس کے گردوپیش کی کائنات ہے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اس کو دنیا کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ مرنے کے بعد ظاہر ہو گا۔ بعد میں ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسلام تسلسل حیات کا قائل ہے۔ موت زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ تبدیلی کا مرحلہ ہے۔ آخرت کی زندگی دنیاوی زندگی کی تکمیل اور نتیجہ ہے۔ گویا دنیا کی زندگی تیاری کی زندگی ہے جس کے نتائج عقبیٰ میں ظاہر ہوں گے۔ کامیابی وہ ہے جو آخرت میں ملے گی۔ ناکامی بھی وہی ہے جو آخرت میں حاصل ہو گی۔ مہلتِ عمر ختم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنے حضور طلب کرے گا۔ وہاں انعامات اور اختیارات کا محاسبہ ہو گا۔ کامیاب ہو جانے والوں کو خدا کی رضا کے نتیجے میں جنت ملے گی اور ناکام ہو جانے والوں کو سزا بصورت دوزخ ملے گی۔

آخرت پر ایمان لانے سے انسانی زندگی کے رنگ ڈھنگ، طور طریقے یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اعمال اور افعال دنیا میں ایک خاص سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اعمال جن کا نتیجہ آخرت میں اچھا نکلے گا وہ

محمود بن جاتے ہیں اور وہ اعمال جن کا نتیجہ آخرت میں بُرا نکلے گا وہ مذموم بن جاتے ہیں۔ آخرت کی جوابدہی کا یقین انسان کو منضبط بنا دیتا ہے۔ بغیر جبر و نگران کے وہ خود ہی نیک روش اختیار کر لیتا ہے۔ آخرت کی معرفت مجرد عقل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مغربی حکماء اور فلاسفہ نے عدم علم کو عدم وجود پہ قیاس کرکے آخرت کا انکار کر دیا۔ جس کے بعد سے مغربی اقوام کی زندگی غلط راہوں پہ ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

اب ذرا نظریہ خلافت کے عطا کردہ تصوّرِ انسان اور رائج مغرب میں رائج تصوّرِ انسان پہ تقابلی انداز میں ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ مغربی مفکرین انسان کی صورت کشی معاشرہ کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ معاشرہ میں کارفرما عوامل تغیر پذیر ہیں۔ اس لیے وقتی اور ہنگامی نظریات کے زیرِ اثر ان کا تصورِ انسان بھی متغیر ہوتا رہتا ہے۔ مزید برآں یہ تصوّر یک رُخا بھی ہے اور ناقص بھی ہے۔ ان بنیادی نقائص کی وجہ سے مغربی معاشرہ میں انتشار ہے۔ عائلی زندگی مختل ہے۔ معاشرہ میں طبقاتی جنگ برپا ہے۔ نظریات میں تصادم ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اغراض پرستی اور تنگ نظری کا دور دورہ ہے۔

اسلام نے انسان کا تصوّر خلیفۃ اللہ فی الارض کا پیش کیا ہے۔ اسلام انسان کو کائنات اور ماورائے کائنات کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ اسلام کے سامنے ازل سے لے کر ابد تک پوری انسانیت ہے اور پوری تاریخ ہے۔ زمان و مکان میں قائم ہونے والے تمام معاشروں اور قوموں پہ یہ تصوّر حاوی ہے۔ یہ تصوّر کائنات کو اور عالمِ انسانیت کو ایک وحدت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اسلامی تصوّرات کا اہم امتیاز توحید ہے۔ تصورِ خلافت مختلف وحدتوں کو جمع کرنے والا ہے۔ کائنات اور انسان ہم آہنگی کے ساتھ ایک بلند تر مقصد کے لیے کوشاں ہیں۔ یہاں انسان مادیت سے بلند تر ہو کر اخلاقی اور روحانی رفعتوں کو چھوتا ہے۔ روحانی ترقی کے لیے یہاں لامحدود میدانِ عمل موجود ہے۔ یہ بے حد عمیق اور بے حد وسیع تصوّر ہے۔

(باقی)